اسلام میں اطاعتِ حکام کی حدود و شروط

جنابِ ڈاکٹر محمد امین صاحب

(۲)

لوگوں کو معروف کا حکم دیں

ایک مسلمان حکمران کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ لوگوں کو معروف کا حکم دے اور منکر سے روکے، معاشرے میں خیر اور نیکی کو پھیلائے اور برائی کا قلع قمع کرے۔ اگر وہ یہ کرے تو اس کی اطاعت ضروری ہے لیکن اگر وہ برائی پھیلائے، معصیت کا حکم دے اور فواحش و منکرات کی اشاعت کا سبب بنے تو اس کی اطاعت نہیں کی جائے گی کیونکہ یہ امور بذاتِ خود معصیت ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے کہ اللہ کی معصیت میں مخلوق کی اطاعت نہیں ہوتی۔ اور نہ کسی حاکم کی اطاعت معصیت میں کرنی چاہیے۔ صحیح مسلم میں ہے۔

"علی المرء المسلم السمع والطاعة فيما احب و كره إلّا ان يؤمر بمعصية فلا سمع ولا طاعة"۔[۱]

اور فرمایا:

"انما الطاعة فی المعروف"[۲]

---

[۱] صحیح مسلم جلد ۱۲ ص ۲۲۶ طبع القاہرہ

[۲] صحیح مسلم " ص ۲۲۷ "

انہی معنوں کی ایک روایت امام بخاریؒ نے حضرت علیؓ کی روایت سے بیان کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سریہ بھیجا اور ایک انصاری کو اس کا سالار بنایا اور اہل سریہ سے کہا کہ اس کی اطاعت کرنا، ایک دفعہ ان انصاری سردار کو غصہ آیا تو انہوں نے کہا کیا نبی کریمؐ نے تمہیں میری اطاعت کا حکم نہیں دیا تھا؟ صحابہؓ نے کہا، دیا تھا۔ تو انہوں نے کہا لکڑیاں جمع کرکے آگ جلاؤ اور اس میں کود جاؤ تو صحابہؓ نے لکڑیاں جمع کیں اور آگ جلائی لیکن وہ اس میں کودنے میں متردد ہوئے، اُن میں سے ایک نے کہا ہم نے آگ سے بچنے ہی کی خاطر تو آپ کی اطاعت کی تھی پھر اس میں داخل کیوں ہوں؟ اسی بحث و مناقشے میں آگ ٹھنڈی ہو گئی۔ پھر جب واپسی پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس واقعے کا ذکر کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا کہ اگر تم لوگ آگ میں گھس جاتے تو اس سے کبھی نہ نکلتے، اطاعت تو صرف معروف میں ہے[1]

اسی طرح بخاریؒ و مسلمؒ دونوں نے حضرت عبادہ بن صامت کی یہ روایت نقل کی ہے کہ:

"دعانا النبی صلی اللہ علیہ وسلم فبایعناہ، فقال: فکان فیما اخذ علینا، ان بایعنا علی السمع والطاعۃ فی منشطنا ومکرھنا وعسرنا ویسرنا واثرۃ علینا وان لا ننازع الامر اھلہ، قال الا ان تروا کفراً بواحاً عندکم من اللہ فیہ برھان"[2]

حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر حالت میں حاکم کی اطاعت کی جائے الّا یہ کہ اس سے کفر صریح سرزد ہو، جس صورت میں عدم اطاعت کے لیے رعایا کے پاس واضح دلیل ہو گی۔ نیز حضرت علیؓ کی روایت سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے کہ جہاں تک مباح امور کا تعلق ہے امیر کی اطاعت ضروری (یعنی صحابہ کرامؓ نے لکڑیاں جمع کیں اور آگ جلائی) لیکن جہاں خلافِ شرع حکم دیا گیا (یعنی آگ میں کودنے کا حکم)، وہیں سے امیر کی اطاعت ختم ہو گئی۔

امام رازیؒ نے آیت اُولی الامر کی تفسیر میں یہ بھی کہا ہے کہ امیر کی اطاعت واجب ہے اگر

---

[1] فتح الباری جلد ۱۸ ص ۱۴۱، ۷

[2] اللؤلؤ والمرجان رقم ۷:۱۷، ص ۴۸۳، ۴۸۴

وہ حق و صواب کا حکم دے لیکن اگر وہ ظلم کا حکم دے تو اس صورت میں اس کی اطاعت واجب ہونے کے بجائے حرام ہوگی[1]

اور حضرت ابوبکرؓ کا یہ قول تو مشہور و معروف ہے کہ آپ نے فرمایا:

"اطیعونی ما اطعت اللہ و رسولہ فیکم فان عصیت فلا طاعۃ لی علیکم"[2]

یعنی میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کروں (ان کی اطاعت کے مطابق تمہیں حکم دوں) اور اگر میں ان کی نافرمانی کروں (یعنی میرا حکم خدا اور رسولؐ کے احکام کے خلاف ہو) تو تم پر میری اطاعت ضروری نہیں۔

یہ چاروں شرطیں جو قرآن و سنّت اور اسوۂ صحابہؓ سے ثابت ہیں۔ اگر حکام میں پائی جائیں تو ان کی اطاعت واجب ہے اور جو ان شروط کی موجودگی میں مسلمان حکمران کی اطاعت سے انکار کرے وہ باغی اور قابلِ قتل ہے کیونکہ وہ مسلمان معاشرے میں فتنے، انتشار اور انارکی کا دروازہ کھولتا ہے جیسا کہ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے:

"انہ ستکون ہنات وہنات، فمن اراد ان یفرق امر ہذہ الامۃ وہی جمیع فاضربوہ بالسیف کائنا من کان"[3]

یعنی میرے بعد یوں اور یوں ہوگا، پھر جو کوئی اُمت میں تفرقہ ڈالے (اپنی امارت کا دعویٰ کرے) جب کہ وہ (پہلے سے ایک امیر پر) مجتمع ہو تو اس کی گردن ماردو خواہ وہ کوئی بھی ہو۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مسلمانوں کو ہر حالت میں مطلق طور پر اطاعتِ حکام کا حکم

[1] مفاتیح الغیب جلد ۱ ص ۳۵۹
[2] ابن ہشام، سیرۃ جلد ۴ ص ۳۴۱
[3] صحیح مسلم بشرح النووی جلد ۱۲ ص ۲۴۱

دیا گیا ہے، جیسا کہ بعض مستشرقین کا خیال ہے[1] بلکہ یہ حکم اس امر سے مشروط ہے کہ وہ خدا اور رسول کے احکام کے خلاف نہ ہو، مسلمان حاکم کی طرف سے ہو جو انصاف پرور اور عادل ہو، شریعت پر عمل کرنے والا اور عمل کروانے والا ہو جیسا کہ تفصیل سے ذکر ہو چکا، لیکن اگر معاملہ اس کے برعکس ہو تو کیا کیا جائے؟ اس سلسلے میں جو مختلف احادیث وارد ہوئی ہیں، اگر انہیں پیش نظر رکھا جائے تو سمجھ میں آتا ہے کہ تین طرح کا موقف اختیار کیا جا سکتا ہے۔ ایک صبر کا، دوسرے نصیحت کا اور تیسرے جدوجہد اور قتال کا۔ ہم ان تینوں مواقف پر مختصر روشنی ڈالیں گے۔

موقفِ صبر

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"من رای من امیرہ شیئاً یکرہ فلیصبر فانہ من فارق الجماعۃ شبراً فمات میتۃ الجاھلیۃ"[2]

یعنی جسے اپنے امیر میں کوئی ایسی بات نظر آئے جو اسے ناپسند ہو تو اسے چاہئے کہ صبر کرے کیونکہ جو مسلمان کی جماعت سے الگ ہوا وہ گویا جاہلیت کی موت مرا۔

اسی طرح ایک دوسری حدیث میں آیا ہے کہ:

"ان رجلاً من الانصار خلا برسول اللہ فقال: الا تستعملنی کما استعملت فلاناً؟ فقال: انکم ستلقون بعدی اثرۃ۔ فاصبروا

1— T ARNOLD, THE CALIPHATE P—47

D. B. MACDONALD, DEVELOPMENT OF MUSLIM THEOLOGY, JURISPRUDENCE AND CONSTITUTIONAL THEORY, PP—58-59-

2 فتح الباری جلد ۱۷ ص ۱۴

حتی تلقونی علی الحوض"[۱]

اس سے پتہ چلتا ہے کہ اگر اختلاف محض آراء کا ہو (اجتہادی اُمور ہوں یا سیاسی و معاشرتی و اجتماعی اُمور) ذاتی پسند ناپسند کا ہو تو حاکم سے ضد اور جھگڑا کرنے کے بجائے صبر سے کام لینا چاہیے، کیونکہ ایسی چھوٹی باتوں پر اُمت میں تفرقہ ڈالنا اور نزاع کا سبب بننا غیر ضروری ہے لہٰذا شرعاً غیر مطلوب ہے۔ *

موقفِ نصیحت

اگر کسی مسلم معاشرے میں حاکم الامر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر عمل نہ کرے بلکہ اس کے برعکس حاکمِ وقت کی مرضی سے یا اس کی موجودگی میں حدود اللہ کو توڑا جا رہا ہو، منکرات و فواحش کا چرچا ہو، برائی غالب ہو اور نیکی دبی جا رہی ہو تو پھر صبر کا حکم نہیں بلکہ ہر مسلمان کا فرض بنتا ہے کہ وہ حاکم کو راستی کی نصیحت کرے۔ حضورؐ نے فرمایا:

"الدین النصیحة: قلنا لمن؟ قال للّٰہ ولکتابه ولرسوله و لائمة المسلمین و عامتهم"[۲]

یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ دین نصیحت ہے تو صحابہ نے پوچھا یارسول اللہؐ کس کے لیے نصیحت (خیر و خوبی چاہنا)؟ تو آپ نے فرمایا: اللہ کے لیے

---

[۱] مسلم کتاب الامارہ باب "الامر بالصبر عند ظلم الولاة و استیثارهم"۔ حدیث کا ترجمہ یہ ہے کہ ایک انصاری صحابی نے تخلیے میں حضورؐ سے عہدہ و منصب عطا کرنے کی درخواست کی تو آپ نے فرمایا میرے بعد ایسے حکمران ہوں گے جو تمہیں تمہارے حقوق نہ دیں گے تو اس وقت صبر سے کام لینا تا آنکہ مجھ سے حوضِ کوثر پر آملو۔

[۲] مسلم کتاب الایمان باب بیان " ان الدین النصیحة"

* یا جہاں یہ اندیشہ ہو کہ موقفِ صبر چھوڑنے سے فتنہ و تفرقہ بڑھے گا، مگر اصلاح کی راہیں اور بھی بند ہو جائیں گی۔ (مدیر)

اس کی کتاب کے لیے، اس کے رسول کے لیے، مسلمان حکام کے لیے اور عامۃ الناس کے لیے۔

اور حضرت عبادہ بن صامتؓ کی جو روایت ہم نے اُوپر نقل کی ہے، مسلم میں اس کے الفاظ یہ ہیں: وعلی ان لا ننازع الامر اھلہ وعلی ان نقول بالحق اینما کنا۔ لا نخاف فی اللہ لومۃ لائم "[1] یعنی ہم اپنے امراء سے نزاع نہ کریں گے لیکن حق بات ہر حالت میں کہیں گے اور اس میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے۔ اسی طرح آپ نے فرمایا ــــ " افضل الجہاد کلمۃ عدل عند سلطان جائر "[2] یعنی ظالم حاکم کے سامنے کلمہ حق کہنا افضل ترین جہاد ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اگر حاکم کی ہاں میں ہاں ملانی ہو تو کسی جہاد کی ضرورت نہیں پڑتی، بلکہ اس کی ضرورت اُس وقت پڑتی ہے جب اُس سے اختلافِ رائے ہو اور اس کی مرضی کے خلاف حق بات اُس کے سامنے رکھی جائے۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اگر حاکم کی رائے اسلامی متقضیات کے مطابق نہ ہو تو اس سے لازماً اختلاف کرنا چاہیے اور حق بات اس پر واضح کرنی چاہیے اور اس اختلاف رائے اور احقاقِ حق کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد قرار دیا، گویا ایسا اختلاف اور اس کے لیے جدوجہد کرنے والا مجاہد کا درجہ رکھتا ہے (کیونکہ اس نے شدید خطروں کو انگیز کر کے اور ایک تشویشناک ماحول میں حق کی بات کہی!)

مندرجہ بالا تصریحات کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر حکام کا طرزِ عمل اسلامی احکام کے مطابق نہ ہو تو مسلمانوں کا فرض ہے کہ انہیں راستی کی نصیحت کریں اور خاموش ہو کر نہ رہ جائیں۔

موقفِ قتال

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے۔ " من رای منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ فان لم یستطع فبقلبہ وذلک اضعف الایمان "[3] یعنی تم میں سے جو کوئی منکر کو دیکھے وہ اسے ہاتھ سے روک دے اور جو اس کی استطاعت نہ رکھے وہ زبان سے

[1] مسلم کتاب الامارہ باب " وجوب طاعۃ الامراء فی غیر معصیۃ وتحریمہا فی المعصیۃ "

[2] صحیح مسلم بشرح النووی جلد ۱۷ ص ۲۴۱

[3] صحیح مسلم کتاب الایمان باب " بیان کون النہی عن المنکر من الایمان "

روکے اور جو اس کی بھی استطاعت نہ رکھے وہ اُسے دل میں بُرا سمجھ لے اور یہ کمزور ترین ایمان کی بات ہے۔

اسی طرح آپ نے فرمایا:

انصر اخاك ظالماً اَوْ مظلوماً [1]

یعنی اپنے بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ اور مزید وضاحت کی کہ ظالم کی مدد یہ ہے کہ تم اُسے ظلم سے باز رکھو۔ اب اگر ظالم کو ظلم سے باز رکھنے کی کوشش ہو تو نہ صرف اس سے اختلاف رائے ہوگا بلکہ بات ضرب و تعزیر سے گزر کر مقابلے تک پہنچے گی۔ اسی طرح ترمذی نے حضرت ابوبکر سے یہ روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: انی سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: "ان الناس اذا راوا الظالم فلم یاخذوا علیٰ یدیہ اوشك ان یعمهم اللہ بعقاب من عنده"۔ یعنی میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اگر لوگ ظالم کو دیکھیں اور اس کا ہاتھ نہ پکڑیں تو بعید نہیں کہ اللہ ان پر عذاب نازل فرما دے۔

اِن احادیث کا عموم اگرچہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے ہے تاہم جہاں بھی ظلم و فسق اور جور و طغیان ہوگا ان کا وہیں اطلاق ہوگا اور امت کے سیاسی فقہا اس امر پر متفق ہیں کہ اگر مسلم حاکم ظلم و جبر اور فسق و فجور سے کام لے تو اس کا عزل واجب ہے۔

تفتازانی نے امام شافعی سے روایت کی ہے "وعن الشافعی رحمہ اللہ ان الامام ینعزل بالفسق والجور۔ وکذا کل قاضٍ وامیر" [2] یعنی امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ حاکم اور فسق اور ظلم سے کام لے تو ہٹائے جانے کے لائق ہے اور اسی طرح ہر قاضی اور والی بھی"۔

امام شہرستانی کا کہنا ہے کہ "وان ظهر بعد ذالك جهل وجور وضلال وكفر انخلع منها او خلعناه" [3] یعنی اگر حاکم سے جہالت، ظلم، گمراہی اور کفر کا صدور ہو تو اُسے خود حکومت

---

[1] صحیح بخاری جلد ۳ ص ۹۸ طبع استنبول ۱۴۰۱ھ۔

[2] شرح العقائد النسفیہ ص ۱۴۵

[3] نہایۃ الاقدام ص ۴۹۶

سے دست بردار ہو جانا چاہیے ، ورنہ ہم مسلمان ، خود اُسے اُتار پھینکیں گے۔

امام غزالیؒ نے فرمایا " ان السلطان الظالم علیہ ان یکف عن ولایتہ وھو اما معزول، او واجب العزل — وھو علی التحقیق لیس بسلطان [1] یعنی ظالم حاکم حکومت کا اہل نہیں ہے، وہ برطرف کیے جانے کے لائق ہے اور کیا جانا چاہیے کیونکہ حقیقی لحاظ سے وہ حکومت کا اہل ہی نہیں ہے۔

یہ اور ایسے دوسرے بہت سے اقوال علماء سے مروی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ علماء کی رائے میں اگر حاکم عدل و انصاف کی بجائے ظلم و جور سے کام لے اور شریعت پر عمل کرنے اور کروانے کے بجائے فسق و فجور سے کام لے اور منکرات و فواحش کے انتشار کا سبب بنے تو وہ حکومت چلانے کا مستحق نہیں ہے اور اُسے ہٹا دیا جانا چاہیے۔ لیکن اُصولی طور پر اس بات کو تسلیم کرنے کے باوجود علمائے اُمت کا اس امر میں اختلاف ہے کہ آیا ایسے حاکم کو بزورِ بازو ہٹا دیا جانا چاہیے یا نہیں؟ کیوں کہ اس میں بہت سے مفاسد کا احتمال بھی ہے۔

مثلاً ایسا تو نہ ہوگا کہ نظام کے سقوط سے انارکی پھیل جائے اور لاقانونیت مسلط ہو جائے یا کسی بیرونی دشمن کا حملہ ہو جائے یا کسی علاقے میں ایسی بغاوت ہو جائے جو اسلامی مقاصد ہی کو پامال کر دے۔ نیز اگر کوئی حرکتِ عامہ پیدا ہو تو اس کے لیے صحت مند ملک گیر لیڈرشپ مہیا ہو گی اور اس کی سربراہی کرنے والوں کو اعتماد و قبول عام حاصل ہو گا۔ ان اُمور کا پورا طرح نقشہ مرتب کیے بغیر یونہی شورش اٹھا دینا اسلامی مفاد کے لیے مضر ہے۔

معتزلہ، خوارج، زیدیہ اور مرجیہ سب اس بات پر متفق ہیں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ضمن میں اگر حاکم ہٹائے بغیر دفعِ منکر ممکن نہ ہو تو ایسے حاکم کو بزورِ بازو ہٹا دینا واجب ہے اور امام ابن حزم نے کہا ہے کہ بہت سے اکابر صحابہ اور ائمہ کبار کا بھی یہی مسلک ہے [2]۔ انہوں نے جو نام گنوائے ہیں ان میں حضرت علیؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت معاویہؓ، حضرت عمرو بن عاصؓ، اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے علاوہ تابعین میں سے سعید بن جبیرؒ، حسن بصریؒ، شعبیؒ اور محمد بن عبداللہ بن حسن شامل ہیں۔ ابن حزم کا کہنا یہ ہے کہ امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور داؤد ظاہری وغیرہ

---

[1] احیاء علوم الدین جلد ۷ ص ۱۱۱

[2] ابن حزم - الفصل فی الملل والنحل جلد ۴ ص ۱۷۱ - ۱۷۳

نے بھی یا تو اس امر کے حق میں باقاعدہ فتاویٰ دیے ہیں یا عملاً اس رائے کو اختیار کیا ہے۔ اس کے برعکس اہلِ حدیث اور اہلِ سنّت خصوصاً علماء متاخرین کی اکثریت نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ حکام کے خلاف خروج سے گریز واجب ہے خواہ وہ نااہل اور غیرعادل ہی کیوں نہ ہوں۔ اور خواہ وہ صحیح طریقے سے برسرِاقتدار نہ آئے ہوں، کیونکہ اس سے فتنے کو ہوا ملتی ہے، اُمت کی ہوا خیزی ہوتی ہے اور اس کے نقصانات اس کے ممکنہ فوائد سے زیادہ ہیں۔⑤

اب جہاں تک عصرِ حاضر میں ان مسائل کی تطبیق کا تعلق ہے تو اگرچہ ہر معاملے میں انفرادی لحاظ سے غور کرنا ہوگا، تاہم عمومی لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ مسلمان ممالک میں اکثریت ایسے حکمرانوں کی ہے جو مسلمان عوام کی مرضی سے برسرِاقتدار نہیں آئے، اور نہ ہی وہ عدل، نفاذِ شریعت اور معروف پر عمل کی اسلامی شروط پر پورا اُترتے ہیں۔ دوسری طرف اسلامی تحریکیں ہیں جن کی بنیاد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نیز اعلائے کلمۃ اللہ اور اقامتِ دین پر رکھی گئی ہے۔ ان میں سے بعض نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ وہ ہر حالت میں آئینی اور قانونی ذرائع کی پابندی کریں گی اور بعض نے قوّت کا طریقہ بھی اپنایا ہے اور ہماری رائے یہ ہے کہ مذکورہ بحث کی روشنی میں ان دونوں رویوں کی گنجائش شریعت میں موجود ہے۔ فرق صرف حکمتِ عملی، اپنی قوّت اور اختلافِ احوال کا ہے۔ جو کہ سراسر اجتہادی اور تقدیری اُمور ہیں۔ تاہم انبیاء کی سیرت، انقلابوں کی تاریخ اور خصوصاً حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ اسلام کا مطلوب انقلاب اگرچہ اپنی داخلی قوّت (یعنی اس کے متبعین کے جذبے، ایمان، تقویٰ اور ایثار) کی وجہ سے آتا ہے۔ تاہم اس انقلاب کی مزاحم خارجی قوتوں کو بزور راستے سے ہٹانا ہی پڑتا ہے۔

---

⑤ عصرِ حاضر میں صورتِ معاملہ یوں ہے کہ ہر غیرمسلم اور مسلم ملک میں ظلم و جبر کے خاتمے کے لیے لادینی تحریکیں برسرِ عمل ہیں۔ اب بجائے اس کے کہ ساری بازی ان کے ہاتھ میں چلی جائے، خود اسلامی تحریکوں کو انقلاب کا راستہ بنانے کے لیے عوام کو تیار کرنا چاہیے۔ ورنہ یہ تو کوئی معقول موقف نہیں کہ ہم اپنے مسلم حکمرانوں کے ظلم و استبداد کی حمایت کرتے رہیں۔ اور دوسری طرف ظلم کش عوام کے مسائل اور جذبات سے آنکھیں بند کر لیں۔ (مدیر)